شام سے پہلے

ایاز رسول

شام سے پہلے

از

ایاز رسول

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔

نام　　شام سے پہلے

شاعر　　ایاز رسول

سن اشاعت　　۲۰۰۸ء

قیمت : ۳۰۰ روپئے

سرورق : عالیہ نازکی

کمپیوٹر کمپوزنگ : نازیہ

ناشر : ایاز رسول

ملنے کے پتے:۔

کتاب گھر سرینگر

کتاب گھر جموں

ہاری پربت

7/10 توی وہار کالونی سدھڑا جموں: 180017

شام سے پہلے کشتیاں ڈوبیں
اور سمندر کی رات باقی ہے

فہرست

		صفحہ
انتساب		
1۔اُردو شاعری کا امکان بھر شاعر	افتخار امام صدیقی۔	1
2۔ایاز رسول کی زبان خاموش	ڈاکٹر عتیق اللہ۔	5
3۔گملے میں چنار	محمد یوسف ٹینگ	11
4۔غزلیات۔		15
5۔نظمیں۔		156

والد محترم کے نام

اردو شاعری کا امکان بھر شاعر

خواب بیں: افتخار امام صدیقی

محترم ایاز رسول نازکی نے جب اپنی ''مٹھی بھر غزلیں'' پہلی بار شاعر کے لیے ارسال کیں انہیں محض اس لیے شائع کرتے بنی کہ ایاز صاحب کی غزلوں نے نہ صرف متوجہ کیا بلکہ مجبور کیا کہ انہیں فوری شائع کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ کشمیر کے ادبی گھرانوں میں سے ایک ایاز صاحب کا بھی ہے۔ ان کے والد میر غلام رسول نازکی شاعر، بڑے بھائی فاروق نازکی بھی۔ ادبی گھرانہ تین یا اس سے زائد قلم کاروں پر مشتمل ہوتا ہے اور ادبی خاندان دو قلم کاروں پر مشتمل ہوتا ہے (بھائی بھائی، بھائی بہن، شوہر بیوی، باپ بیٹی/بیٹا) میرے محدود مطالعے کے مطابق کشمیر میں ایک ادبی گھرانہ اور ہے۔ نشاط کشتواڑی مرحوم ان کے صاحبزادے بشیر احمد بشیر، ان کے صاحبزادے اعجاز حسین۔ نشاط صاحب نے ایک فعال ادبی سانسیں کار آمد کی تھیں۔ یہ تحقیق کا اہم ترین موضوع ہے۔ وہ علامہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد اور کئی ایک کتابوں کے مصنف، مرتب اور تالیف کار تھے، ان کے صاحبزادے اور پوتے ادبی رسائل میں کم ہی نظر آتے ہیں۔

جب ایاز صاحب نے مجھ ہیچمدان سے اپنے دوسرے شعری مجموعے ''شام سے پہلے'' کے لیے تاثرات ''قرطاس بند'' کرنے کے لیے کہا تو میں سوچتا رہ گیا کہ ایک عمدہ شاعر اور پختہ کار شاعر کے لیے کیا لکھوں مگر ان کی فرمائش پر مجھے قلم + کاغذ + سوچ ہو جانا پڑا اور یہ چند بے ربط، اول جلول سطریں تحریر کر رہا ہوں۔

ایاز رسول نازکی صاحب مزاجاً غزل رنگ شاعر ہیں۔ ان کے نام کا لاحقہ نازکی میر تقی میر تک لے جاتا ہے۔

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ایاز صاحب غزل مزاج شاعر ہیں تاہم وہ نظمیں بھی تخلیق کرتے ہیں۔ یعنی آٹے میں نمک کے مصداق، شاعری دونوں اصناف میں سمندروں سمندر ہے۔ موصوف کسی ایک ادبی

تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں ہیں۔ ترقی پسند، جدیدیت، مابعد اور مابعد میں اسیر ہوئے آزادانہ فضا میں ''شعری سانسیں'' لے رہے ہیں اور بہت حد تک کامیاب و کامراں ہیں۔ امکانات بتدریج روشن ہو رہے ہیں۔

جب بھی مجھے کسی قلم کار پر دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ یا تاثراتی شذرات لکھنے ہوتے تو میں تجسس و تحیر کے بھنور میں فنکار کے تعلق سے بہت سارے سوال قائم کر دیتا ہوں تا کہ قاری میری تحریر کو پڑھ کر مذکورہ قلم کار کو اسی تناظر میں دل جمعی کے ساتھ پڑھے جو میں چاہتا ہوں۔ کبھی بھی نثری تحریر جب تک لکھاری کو موہ نہ لے ممدوح اور قاری دونوں کو مایوسی ہوگی۔ اب میں اپنے رسول نازکی کی شاعری سے مٹھی مٹھی شعر رقم کر رہا ہوں۔

یہ امیر شہر کا دعویٰ ہے
منصفی ہے عدالتوں کے بغیر
خار ہوتے نہیں گلوں کے ساتھ
عشق ہوتا عداوتوں کے بغیر

.....

چڑھتے سورج ہیں خوب شہرت ہے
کون پوچھے گا جب اتر جائیں

.....

اس کی پہچان ہے یہی لوگو
اس کے آتے ہی حادثہ ہوگا
وہ عدالت ہی کا لعدم ہوگی
میرے حق میں جو فیصلہ ہوگا

.....

آس میں کاٹے بیس برس اور یاس میں کاٹے بیس برس
کچھ نہ پوچھو ہم نے کیسے کاٹے ہیں کیسے چالیس برس

چھ شعر کی یہ غزل پورے مجموعے کی نمایاں لحن والی غزل ہے۔ اس کا لہجہ، اسلوب، لفظیات، تمام تر شعری لوازمہ، ایک مکمل غزل کا روپ سروپ ہے۔ جی کرتا ہے کہ پوری غزل جو کہ ''عشق رنگ'' ہے، آپ کو پڑھواؤں کہ نوجوانی، کسی نوجوان بدن کو دیکھ کر کس طرح کی سوچ بنتی ہے۔ پھر بھی ایک شعر جو کہ ''تجربہ بھر'' ہے آپ غور سے سن لیجیے۔ لیکن چھ شعر والی اس غزل میں کرب اور تصوف کا سایہ بھی ہے۔

آخر شب میں سارے مومن ریشہ ریشہ بھیگ گئے
زاہد جتنے خشک بچے ہیں ان پر تو ابلیس برس
ہم کو بچھڑے کتنے گذرے سال بتادوں اے کشمیر
تیرے سولہ میرے سولہ ہوتے ہیں بتیس برس

اس ایک شعر میں کشمیر کی پوری سیاست، کل، آج سب کچھ سما گیا ہے۔ غزل کا یہی تو کمال ہے کہ ریزہ خیالی کے باوجود دو مصرعوں میں کائنات بھر خیال، ایک وسیع تر رنگا رنگ کینوس بن جاتا ہے۔

ایاز صاحب کی شاعری میں عشق، ہجر و وصال، انتظار، شکایات، طلب، جستجو وغیرہ کے ساتھ مذہبی سماجی اور سیاسی شعور بھی ہے۔ وہ اپنے آزاد خیالات کو بہت دیر تک چھان پھٹک کر کے، شعر، کاغذ بند کرتے ہیں۔

ایک گنبد نما عمارت دل
آنے جانے کا در نہیں دیکھا

اپنی شاعری کے بارے میں خوش گمان بھی نہیں ہیں۔

شعر گوئی ایاز کی توبہ
اس میں کوئی ہنر نہیں دیکھا

.....

شاعری ہم پہ چھوڑ دینی تھی
مرزا غالب سپہ گری کرتا

.....

جو غزل بھی کہی کہی ہم نے
دفتر واقعات ہے پیارے

شعری مجموعہ ''شام سے پہلے'' کی پچاس سے زائد غزلوں میں تجربہ، مشاہدہ، شعر گوئی، شعری تراکیب، بندشیں سب کچھ ہے۔ رموز و اوقاف ہیں، قوافی کے رنگا رنگ روپ سروپ ہیں۔ کشمیر کا سارا حسن، ایاز صاحب کی شاعری کا آسمان بن گیا ہے۔

میرے لیے بہت آسان کام تھا کہ ایک توصیفی پیراگراف لکھ کر چالیس پچاس شعر اور ان کی شرح وبسط کے ساتھ رطب اللسان ہو جاتا، آج یہی تو ہو رہا ہے۔ کتابوں پر توصیفی شذرے لکھنے والے اپنے ممدوح کو کسی بھی طرح میر و غالب اور اقبال سے کم نہیں لکھتے۔

محترم ایاز صاحب کی شاعری، سرسری گذر جانے والی نہیں ہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر، احساسات میں جذب کرتے ہوئے، اپنے وجود کو اس میں غرق کر کے روح کے سمندر کی تھاہ میں رکنا اور پھر دیکھنا کہ زمین و آسمان سارا عالم، ایاز صاحب کی شاعری، اور اس کا قاری مکالمہ بن کر پہلے گونج، پھر آواز اور انتہاؤں پر شور، لیکن خاموشی کے مراقبے والی شاعری بن جاتے ہیں جس میں قاری گم ہو جاتا ہے اور پھر ایاز رسول اور قاری ایک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔

شاعری اسی کا نام ہے جو حلال نشہ بن جائے اور سرور کو پورے وجود کے ساتھ دائم و قائم کر دے۔

میر و غالب اور انیس ایسے ہی شاعر تو تھے۔

افتخار امام صدیقی

۲۴ نومبر ۲۰۰۷ء

بروز ہفتہ، دو بجکر ۲۰ منٹ دوپہر

ایازِ رسول کی زبانِ خاموش

ڈاکٹر عتیق اللہ دہلی یونیورسٹی

ہمارے دور کی شاعری میں دانش وری کا عنصر ایک حاوی رجحان کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمیں سنجیدہ اور متین موضوعات و مفاہیم سے کوئی غرض ہی نہیں ہونی چاہئے۔ میرے کہنے کا مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت اور اپنے جذبوں سے فرار کیوں چاہتے ہیں۔ ایلیٹ نے یہ کلیہ قایم کر کے اپنی شاعری کا جواز مہیا کیا تھا۔ اس کی نظر میں بڑی شاعری کا وہ تصور تھا جو کلاسیک کے یہاں دستیاب ہے۔ نیز جو اپنی بیش تر صورت میں ڈرامائی فن یا بیانیہ پر استوار ہے۔ شخصیت یا اپنے جذبوں سے گریز اختیار کر کے شاعر بہت بڑی قیمت چکاتا ہے۔ وہ اظہار کی اس طمانیت سے محروم ہو جاتا ہے جو فن کار کے لئے فن کا سب سے بڑا انعام ہے۔ دراصل تنقید کے رعب وادب نے ہماری اہلیتوں پر ہی قدغن لگادی۔ تنقید، تخلیق کے لیے ایک بہتر فضا سازی کا کام کرتی ہے۔ یا اسے کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس ہماری تنقید نے اپنا بیش تر وقت کلیہ سازی اقربا نوازی اور گروہ بندی کی نذر کر دیا۔ شاعری سے جذبے کی چمک اُڑ گئی۔ زندگی کا خوبصورت تصور فنا ہو گیا۔ کبھی کبھی جو خوابوں میں زندگی بسر کرنے کے مواقع پیدا ہوتے تھے اُن سے بھی ہم محروم ہو گئے۔ عشق ایک بھولی بسری چیز ہو کر رہ گیا۔ جیسے ہجر و وصل کی وارداتیں ہی رونما ہونا بند ہو گئیں۔ جیسے ہماری دنیا امکانات سے خالی ہو گئی ہے۔ ایک بے آب و گیاہ دشت بے کنار کا سامنا ہے۔ سراب ہی سراب، بنجریت ہی بنجریت تشنہ سری ہی تشنہ سری، چاروں دھام ایسا سناٹا، جس نے ہمارے اور چھور ہی میں نہیں ہماری روح میں ڈیرا جما لیا ہے۔ سگ خوئی ہی سگ خوئی، مردم بے زاری ہی مردم بے زاری ہماری پہچان بن کر رہ گئی ہے۔ اندھیروں کے نوحے ہیں لیکن انہیں گہرے اور گاڑھے اندھیروں میں کچھ روشنی کی کرنیں بھی بار بار اپنی چمک دکھا کر کسی گہرے غار میں ڈوب جاتی ہیں۔ ہماری بدتوفیقی ہے کہ ہمیں وہ کرنیں نظر

ہی نہیں آتیں یا ہم انہیں دیکھنا ہی نہیں چاہتے یا دیکھتے بھی ہیں تو ہم انہیں پکڑنا نہیں چاہتے۔ ایک ایسی بے حسی ہے جو ہمارے وجود پر قابض ہوگئی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ایاز رسول کی شاعری ان کے جذبوں کی زبان میں بات کرتی ہے۔ ان کا تناظر لہولہان ہے، پورا کشمیر ایک انتہائی غیر یقینی کے دور سے گذر رہا ہے جوان نسلیں بوڑھی گئیں اور بوڑھوں نے دائمی عافیت کی راہ لے لی۔ لیکن صورت حال کی یکساں روی میں کا فرق نہیں آیا۔ ایسے دگرگوں حالات میں بھی ایاز رسول نے شاعری کے تقاضوں سے روگردانی کو شعار نہیں بنایا۔ انہوں نے اپنے ایک قطعہ میں ہر کس و ناکس کو غمناک ضرور بتایا ہے اور یہ بھی کہ روش پر خاک اڑ رہی ہے، ستم کی اندھیاں چل رہی ہیں، زندگی، خس و خاشاک ہی کا دوسرا نام ہے۔ وہ سیاہ رُخ ہے جو پورے منظر نامے پر محیط ہے۔ لیکن ایاز رسول پھر بھی یہ کہے بغیر بھی نہیں چوکتے۔

فصلِ گل کی تاک میں زندہ رہو۔

کبھی کبھی اس قسم کی شاعری ایک عمومی ضرورت بن جاتی ہے۔ دراصل شاعری اپنے لیے کم دوسروں کے لئے زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ دوسروں کے لئے ہی ہوتی ہے۔ قاری یا سامع کو سامنے سے ہٹا لیجئے شا ایک طاق نسیاں کی چیز بن کر رہ جائے گا۔ ایاز رسول یہ خوب جانتے ہیں کہ ان کے ایک معنی کو ہزار م بہم پہنچانے والا قاری ہی ہے اور قاری کی سرشاری ہی میں ان کی سرشاری کا راز مضمر ہے۔ انہیں ا جذبوں میں قاری کی شمولیت پر خاص اصرار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے لمحوں کو چُننے کے لیے بے تا اور سرگراں رہتے ہیں جن سے زندگی کو نیا ایقان میسر آئے۔ ٹوٹے ہوئے حوصلوں کی نئی شیرازہ بند ممکن ہو سکے۔ کچھ نئے خواب مہیا کر سکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر فریب سازی کے ہنر بھی واقف ہو۔ ایاز رسول کو یہ فن خوب آتا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے ''مرمر گیت''۔ میں نے یہ نظم کئی پڑھی اور ہر بار ایک نئی مسرت اور ایک نئے احساس سے دوچار ہوا۔ نظم کیا ہے ایک مسلسل خواب ہے کہیں ٹوٹتا نہیں، ایک حقیقی سے زیادہ حقیقی اور واقعی سے زیادہ واقعی فریب آگیں دنیا کے عقب میں ہزار دنیاؤں کے باب ہم پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔

مرمر کی وہ مورت جیسی
مرمر کا ہے اس کا گھر
مرمر کی ہیں سب دیواریں
مرمر کے ہیں بام و در
مرمر کا ہے آنگن اُس کا
مرمر کے ہیں سب پتھر

مرمر کے ہیں سارے پھول
مرمر کے ہیں اس کے پیڑ
مرمر کے ہیں ان کے پھل
مرمر کے ہیں سب پنچھی
مرمر کے ہیں ان کے پر
مرمر کا ہے اُس کا چاند
مرمر کی ہے اُس کی دھوپ
مرمر کا ہے اس کا دن
مرمر کی ہے اس کی رات

مرمر کی ہے اُس کی رسوئی
مرمر کے ہیں اس کے برتن

مرمر کا ہی آٹا ہے

مرمر جیسے ہاتھوں سے

گوندا اس نے مرمر پر

مرمر کی اس بھٹی میں

مرمر کی ہی لکڑی سے

مرمر جیسی آگ ہے سلگی

مرمر کی اب روٹی اُس نے

مرمر کی ہی آنچ پہ سینکی

ایاز رسول نے بڑی قلندرانہ طبیعت پائی ہے۔ان کی غزل کے یوں تو کئی Shades ہیں۔لیکن ان آپ بیتی کا شیڈ بڑا دلاویز ہے۔غزل کا شاعر بالعموم روایت کا مارا ہوتا ہے، روایتی مضامین اور روا اسالیب اس کے ذہن پر آسیب کی مانند سوار رہتے ہیں۔ایاز رسول کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی با اپنی زبان میں ادا کر سکیں۔اپنی بات سے مراد اپنے تجربے، وہ تجربے جن کا تعلق ان کی اپنی ذات ہے۔اسی لیے بار بار ان کا بچپن اُن کے لاشعور سے عُود کر آتا ہے۔ایک غزل جوان کی کامیاب تر غزل ہے ایک خود گذشت نامہ بن گئی ہے پوری غزل میں قافیے کو انہوں نے بڑی خوبی اور بے ساختگ کے ساتھ نبھایا ہے۔ایاز رسول نے اس موڑ کو دوسری جگہ کام میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ ملاحظ فرمائیں۔

آس میں کاٹے بیس برس اور یاس میں کاٹے بیس برس

کچھ نہ پوچھو ہم نے کیسے کاٹے ہیں چالیس برس

جس نے ہم کو عشق سکھایا جس سے سمجھے سارے گُر

اس کی عمر تھی سولہ سترہ اپنی تھی اکیس برس

آتے جاتے ہر موسم میں اُس کا جادو قایم ہے
بیس برس سے دیکھ رہا ہوں لگتی ہے انیس برس
ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتادوں اے کشمیر
تیرے سولہ میرے سولہ ہوتے ہیں بتیس برس

ایاز رسول نے لمسی پیکر آفرینی بھی خوب کی ہے۔ان کے نہاں کدہ یادداشت میں کئی بھولی بسری یادیں منہ بسورے ہوئے پڑی ہیں۔ جیسے ہی کسی پھول پر نظر پڑتی ہے یا پورے چاند کا سامنا ہوتا ہے یا کسی غنچے کی چٹک انہیں سنائی دیتی ہے۔ان کے ذہن کے در و بام پر اجالا سا پھیل جاتا ہے۔ایک نورانی بدن کی یاد انہیں ہر اور چھور سے روشنیوں سے شرابور کر دیتی ہے۔انہیں وصل کے لمحے کبھی نہیں بھولتے بلکہ وہ طول طویل ہجر کی ساعتوں کیلئے بہت بڑی ڈھارس بن جاتے ہیں۔

کس کا نہ جانے لمس سمایا لحاف میں
رہ رہ کے رات مجھ سے بدن مانگتی رہی

سحر ہے کیسا انگڑائی میں
جادو دیکھ بدن میں کیا ہے

جسم ہے یا سنطور رباب — پایل جس پر ہے مضراب
پایل کے کیا اپنے گیت — بج اٹھتا ہے مست شباب
اس کے تن کی خوشبو سے — مہکے گلشن اور گلاب
سوکھے پیاسے ہونٹوں پر — آ کے رکھ دے گیلے ہونٹ

نیلے داغ بدن پر ہیں یا اس کے زہریلے ہونٹ

ایاز رسول کے ایک پھول کا نام کشمیر ہے جو ایک گہرے زخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گیا ہے۔جس کا ماضی خوں چشیدہ ہے حال لہولہان اور مستقبل غیر یقینی۔مستقلاً سیاسی سنگدلی کا شکار۔مرمر کے پہاڑوں سے خون کی دھارائیں پھوٹ رہی ہیں۔وادیاں لہولہان ہیں۔ڈل زخموں سے چور ہیں

۔ایاز نے خامشی کی زبان میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو بلند سے بلند آواز میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس خاموش زبان کی تہہ میں ہم بڑی آسانی سے unsaid کو پوری بلند آواز کے ساتھ سُن سکتے ہیں۔

امن کا بادل ہے لیکن میرے کھیتوں پر ہی
دیکھنا تم ایک دن یہ جنگ لے کر آئے گا

جس شہر میں سانسوں پہ بھی تعزیر لگی ہے
اس شہر کی خاطر وہ ہوا مانگ رہا تھا

پرندے یہاں سے گزرتے تو ہیں
یہاں پر بناتے نہیں آشیانہ

آپ کے گھر سے لاش نکلی ہے
آپ کے ہاں کوئی ڈرا بھی نہیں

خزاں کی آمد آمد ہے دبستانِ بہاراں پر
تو پھر اوراقِ گل ہی سے سیں گے اب کفن بلبل

ہم گرے ہیں اگر بلندی سے
درحقیقت زوال کس کا ہے

پھولوں سے بھی نازک تھی۔ پہلے یہ پتھریلی ریت

اس تمام سیاسی رسہ کشی نے عوام کو دو پاٹوں کے بیچ میں پیس کر رکھ دیا ہے۔ ایاز کو ایک ہی راہِ نجات دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ ہے:۔

ہم یہ کشمیر چھوڑ دیتے وہ
اس کا ہم حل نکال سکتے تھے

☆☆☆☆☆

محمد یوسف ٹینگ

ایاز رسول نازکی کے دوسرے مجموعے کو پہلی نظر میں دیکھتے ہوئے مجھے ان باتوں کا احساس ہوا:

۱۔ کہ انسان کے دوسرے خصائل کی طرح شاعری بھی اس کے جنین (Genes) میں مضمر رہتی ہے۔ لیکن نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اس میں نئے رنگوں کی شگوفہ کاری بھی ہوتی رہتی ہے۔

۲۔ اردو زبان کشمیر میں ایک جدید تر اور خوب تر محاورے میں ارتقاء پذیر ہو رہی ہے اور اس کی زمینی حقیقتوں کی زبوں حالی کے باوجود یہ ہمارے یہاں کم از کم ایک دو نسلوں تک نطق کو شاداب اور ناطقے کو سیراب کرنے کے امکانات سے مملو ہے۔

۳۔ اظہار کی بنیادی معنویتوں کے باوجود اس کے تازہ پھول پتے عصری حسیت سے شرابور ہو کر نئے موسم اور مزاج سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت دکھاتے رہتے ہیں۔

۴۔ اس مجموعے کے شاعر کی تعریف و توصیف میں الفاظ کے اسراف کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے چند اشعار بلکہ مصرعے ہی رباب کے زخمے کی طرح طبیعت میں سوز و ساز کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اپنے شعری رجحان کی اصلیت کو ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً یہ چند اشعار ؎

گل کے اوراق رنگ سے خالی
یہ صحیفے ہیں آیتوں کے بغیر

خود کو ہر وقت دیکھتا ہوگا
ہاتھ میں اس کے آئینہ ہوگا

سامنے وہ ہمارے بیٹھے تھے
دل میں اُن کے خیال کس کا تھا

پھر بھی خوشبو ہمیں پتہ دیتی
آپ پائل نکال سکتے تھے

ان اشعار کی زبان اور لہجے کے علاوہ ان کی برجستہ رمزیت فوراً متوجہ کرتی ہے اور اس بات میں شک وشبہے کی کم گنجائش رہتی ہے کہ یہ صرف سخنوری کی مشق کا نتیجہ نہیں ہیں اور نہ خیال آرائی کی مشقت کے ترجمان۔ ان میں خالص شعر کے ارتعاش موجود ہیں اور اس لیے اپنی صداقت کا قائل کر دیتے ہیں۔

مجھے اس مجموعے کے شاعر کی سہل بیانی نے بھی بہت متاثر کیا ہے۔ اردو ہمارے یہاں اپنی بقا کے لیے جو جنگ لڑ رہی ہے اس میں اس کے لب و لہجے اور رمز و کنایے کی عوام پسندی اس کا بہت بڑا سامان حرب ہوگی۔ کیونکہ اب یہاں کسی کو فرہنگ کی تصدیق اور اردو کی بڑی روایت سے توثیق کرنے کی نہ رغبت ہے اور نہ فرصت۔ اس حال میں ایاز رسول کا صاف وشفاف اسلوب بہت دل کو لبھاتا ہے۔ لیکن اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لہجے کی عوام نوازی کے باوجود احساس اور تصور کی خواص پسندی کو قربان نہیں کیا ہے۔ اس مجموعے کے اچھے اشعار کو پڑھ کر اردو کے اچھے اور کئی صورتوں میں بڑے شاعروں کی آوازیں ذہن میں گونج پیدا کرتی ہیں۔ لیکن وہ عامیانہ پن اور فلمی ابتذال سے اپنا دامن بچا لیتی

ں۔ میں اسے شاعر کی حسیت کی پاک دامنی کے برابر سمجھتا ہوں۔ اردو کے تمام سخن
رایوں کے لیے اس روایت کی پاسداری ممکن نہیں ہوسکی ہے۔ مثلاً ان اشعار کو دیکھیے یہ
ا ہر خط نظر (Eye Line) سے زیادہ بلندی پر نہیں ہیں لیکن ان کی عمومیت کے باوجود
ں میں کلاسیکی مقامات و موضوعات کی بھینی بھینی خوشبو موجود ہے ۔

آتے جاتے ہر موسم میں اس کا جادو قائم ہے
بیس برس سے دیکھ رہا ہوں لگتی ہے انیس برس

لڑکیوں کی ہیں انگلیاں زخمی
اس جگہ سے وہ نوجواں گذرا

پارس منی تھی ناگ کے منہ میں چھپی ہوئی
ناگن لپٹ لپٹ کے وہ پھن مانگتی رہی

س مجموعے میں سخن سرائی کی سطح بھی بدلتی رہتی ہے۔ اردو زبان جس تمدنی پس منظر کی ترجمان
ہے وہ شاعر کو بعض اوقات جذبے کے کھیل میدان سے اوپر لے کر زیادہ بلیغ اشاروں میں بات
رنے پر اکساتی ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں

صرف اردو میں ہی ان تلمیحات کو کھولا جا سکتا ہے اور ان کی خوبصورتی کی داد دی
سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجموعے کے شاعر کی ایک بڑے تمدن کے شاندار ایوانوں
سرسائی ہے اور وہ ان سے اپنا دربارِ سخن آراستہ کرنے میں بہت لطف اندوز ہوتا ہے ۔

قتل کرنا ہے تو دستور نبھانا ہوگا
سر ہمارا تجھے نیزے پہ اٹھانا ہوگا

خط کوفی میں وہ ابرو لکھنا
خط گلزار میں گیسو لکھنا

جو دیکھی دست دامان قطرہ
سمندر پانی پانی ہوگیا ہے
میرا جسم بھی سوکھ چلا ہے نیل
کے ساحل جیسا کھیت
ملک سلیماں پر تو لہرا، بادل
بن ، بلقیس، برس

آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں بلقیس کو بادل کے ہمرنگ اور ہم فصل بتانا ایک جرات منداور میرے نزدیک بہت سہانا انداز بیان ہے۔

ایاز رسول نازکی کے سلسلہ سخن میں صرف قد وگیسو کی پیائش وآرائش نہیں ہے۔اپنے حشر آساز مانے کی کسک اور خلش بھی موجود ہے۔اس مجموعے میں اس کے کتنے ہی نقوش ابھرتے ڈوبتے ہوئے نظر آئیں گے لیکن میں ایک شعر کو اس کے محبوب کشمیر کا بڑا دل گداز نوحہ سمجھتا ہوں اور اس کو نقل کرنے کے بعد قیل وقال کرنے کو لاحاصل خیال کرتا ہوں۔یہ خود آپ کے احساس میں تیز برچھی کی طرح اتر کر اپنی داد حاصل کرے گا۔

اب کہیں پر بھی نہیں ہوگا چنار
میں نے گملے میں ابھی بویا چنار

☆☆☆☆☆

☆

پہلے جیتے تھے نفرتوں کے بغیر
اب بھی جیتے ہیں چاہتوں کے بغیر

خار ہوتے نہیں گلوں کے ساتھ
عشق ہوتا عداوتوں کے بغیر

عشوہ و غمزہ و ادا یعنی
کچھ نہیں ہے سیاستوں کے بغیر

یہ امیرِ شہر کا دعویٰ ہے
منصفی ہے عدالتوں کے بغیر

اور کیا زندگی میں رکھا ہے
وصل کی چند ساعتوں کے بغیر

گل کے اوراق رنگ سے خالی
یہ صحیفے ہیں آیتوں کے بغیر

ہم بھی رسوا مگر نہیں ہوتے
تم بھی ہوتے جو شہرتوں کے بغیر

ہیں فصاحت سے نابلد ہم بھی
شعر بھی ہیں بلاغتوں کے بغیر

ان کے در پر اگر رہے برسوں
کچھ ملا بھی ملامتوں کے بغیر

پڑھ رہا ہوں بڑی توجہ سے
کچھ کتابیں عبارتوں کے بغیر

ہم نہ مومن ہیں ہم نہ کافر ہیں
کلمہ گو ہیں عبادتوں کے بغیر

ایسے درویش سے عقیدت ہے
جس کو دیکھا کرامتوں کے بغیر

تم نے دیکھا ایازؔ کو صاحب
نازکی ہے نزاکتوں کے بغیر

☆

وقت ہے اب بھی گر سدھر جائیں
شام ہوتے ہی اپنے گھر جائیں

ہم تو صحرا نہ تھے مگر پھر بھی
ریزہ ریزہ یوں ہی بکھر جائیں

چڑھتے سورج ہیں خوب شہرت ہے
کون پوچھے گا جب اتر جائیں

تورا بورا کی ان گپھاوں میں
رات کا وقت ہے کدھر جائیں

یہ تو سوچا نہیں کسی نے بھی
شہر سے بن ملے گزر جائیں

اگلا موسم کسی نے دیکھا ہے
عین ممکن ایاز مرجائیں

☆

خود کو ہر وقت دیکھتا ہوگا
ہاتھ میں اس کے آئینہ ہوگا

اُس کی پہچان ہے یہی لوگو
اُس کے آتے ہی حادثہ ہوگا

خوب گزرے گی دُور صحرا میں
قیس صاحب سے رابطہ ہو گا

ہم ستاروں سے ہو کے آئیں گے
درمیاں اُن کے راستہ ہوگا

اُن سے ملنے کا سلسلہ ہو بھی
بات کرنے کا حوصلہ ہوگا؟

وہ عدالت ہی کالعدم ہوگی
میرے حق میں جو فیصلہ ہوگا

ڈل کے پانی میں عکس کس کا ہے
آئینے پر وہ آئینہ ہوگا

☆

آس میں کاٹے بیس برس اور یاس میں کاٹے بیس برس
کچھ نہ پوچھو ہم نے کیسے کاٹے ہیں چالیس برس

جس نے ہم کو عشق سکھایا جس سے سمجھے سارے گر
اُس کی عمر تھی سولہ سترہ اپنی تھی اکیس برس

آتے جاتے ہر موسم میں اُس کا جادو قائم ہے
بیس برس سے دیکھ رہا ہوں لگتی ہے انیس برس

میرا جسم بھی سوکھ چلا ہے نیل کے ساحل جیسا کھیت
ملکِ سلیماں پر تو لہرا بادل بن بلقیس برس

آخر شب میں سارے مُومن ریشہ ریشہ بھیگ گئے
زاہد جتنے خشک بچے ہیں اُن پہ تُو ابلیس برس

ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتادوں اے کشمیر
تیرے سولہ میرے سولہ ہوتے ہیں بتیس برس

☆

درد ہے اب کہیں ذرا بھی نہیں
جسم میرا مگر مرا بھی نہیں

آپ کے گھر سے لاش نکلی ہے
آپ کے ہاں کوئی ڈرا بھی نہیں

بوڑھا پنچھی یہیں کہیں اُترا
دام کا رنگ تو ہرا بھی نہیں

رات فکرِ سخن میں گزری ہے
جسم اُس کا غزل سرا بھی نہیں

وہ محل بھی خرید کر نکلے
ایک سکے میں جو کھرا بھی نہیں

ہم تو ہوش و حواس کھو بیٹھے
جام اس نے ابھی بھرا بھی نہیں

درد ہلکا سا اب بھی ہوتا ہے
زخم دِل کا اگر ہرا بھی نہیں

☆

ابر آئے گا دبے پاوں کہاں جاؤ گے
باڑ میں ڈوب گیا گاوں کہاں جاؤ گے

شعلے برسائے گا سورج تو چھپوگے کیسے
اب نہ وہ پیڑ نہ وہ چھاوں کہاں جاؤ گے

راہ اب اور کٹھن ہے تجھے معلوم نہیں
زخم ہی زخم ہوئے پاوں کہاں جاؤ گے

اسی رستے ظفرؔ اقبال گیا تھا اک دن
وہ رہی اس کی کھڑاؤں کہاں جاؤ گے

ایک میں نے ہی ترا ساتھ نبھایا اب تک
میں تجھے چھوڑ کے گر جاوں کہاں جاؤ گے

ایک تم ہی میرے شعروں کو سمجھتے ہو ایازؔ
میں غزل کس کو سنا جاوں کہاں جاؤ گے

☆

عشق میں ہم نے سر نہیں دیکھا
اُن پہ پھر بھی اثر نہیں دیکھا

دُھن سمائی تھی ایک منزل کی
راستہ پُر خطر نہیں دیکھا

تم سے بڑھ کر حسین چہرے تھے
ہم نے لیکن اُدھر نہیں دیکھا

ڈیڑھ کمرے میں زندگی گزری
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا

ایک گنبد نُما عمارت دل
آنے جانے کا در نہیں دیکھا

پیڑ جس نے لگادیا ہوگا
اُس نے اُس کا ثمر نہیں دیکھا

سارا جنگل ہی جل گیا آخر
آگ نے تو شجر نہیں دیکھا

ہم بھی جموں کے ہوگئے آخر
ہم نے ایسا نگر نہیں دیکھا

کوئی کہتا تھا مُو سے نازک ہے
کوئی کہتا کمر نہیں دیکھا

شعر گوئی ایازؔ کی توبہ
اِس میں کوئی ہُنر نہیں دیکھا

☆

عشق میں کوئی ہمسری کرتا
ہم کو الزام سے بری کرتا

ایک بوتل میں وہ سما جاتی
اُس کو جادو سے میں پری کرتا

چھیڑ معصوم سی چلا کرتی
وہ بھی ہنس ہنس کے دلبری کرتا

اس نے جنگل جلا دیے لیکن
شاخ اک پیڑ کی ہری کرتا

چاند آتا جو روز آنگن میں
ساتھ میرے سخن وری کرتا

شاعری ہم پہ چھوڑ دینی تھی
مرزا غالب سپہ گری کرتا

ایک دن تجھ کو ڈوب جانا تھا
جو بھی کرتا تُو سَر سَری کرتا

خاک ہوتا وہ سَربلندی میں
پا ئمالی میں سَروری کرتا

شعر کہتا نہیں اگر میں بھی
خرقہ پہنے قلندری کرتا

وہ جوانی اَیاز ایسی تھی
بات میں بھی کھری کھری کرتا

☆

خیر کے بدلے شر پسند ہوا
غیر تم کو اگر پسند ہوا

منتخب تھا جو کجکلاہوں میں
کوہکن کو وہ سر پسند ہوا

کوئی دیوار تھی نہ صحرا میں
قیس صاحب کو گھر پسند ہوا

زندہ رہنے کا فن نہیں سیکھا
شاعری میں ہُنر پسند ہوا

کس کو منزل کی چاہ تھی لوگو
میں ازل سے سفر پسند ہوا

خیر کی جو دہائی دیتا تھا
شخص وہ کیسے شَر پسند ہوا

بجلیاں جس کی تاک میں دیکھوں
مجھ کو ایسا شجر پسند ہوا

کوئی آنگن بٹا نہ ہو جس میں
ایک ایسا نگر پسند ہوا

☆

شعر تو شش جہات ہے پیارے
اِس میں کُل کائنات ہے پیارے

کون تخمینے، کون منصوبے
ہر عمل واردات ہے پیارے

صبح جانا ہے ، صبح تو ہولے
یہ ابھی تک تو رات ہے پیارے

ہائے نازک مزاج دل کب سے
خوگر حادثات ہے پیارے

زندگی کو دوام ایسے ہے
زندگی بے ثبات ہے پیارے

پھول کھلتے ہیں میرے آنگن میں
آج کوئی تو بات ہے پیارے

ساتھ میرے تُو چل پڑا لیکن
ہاتھ میں کس کا ہاتھ ہے پیارے

تپتے صحرا میں پیڑ کی چھاؤں
اک دُعا میرے ساتھ ہے پیارے

ایک خندق سے بچ گئے لیکن
اور آگے بھی گھات ہے پیارے

دوست دشمن کوئی نہیں ہوتا
سب کی اپنی ہی ذات ہے پیارے

چال یہ مان کر چلے ہم بھی
شہہ کے بدلے میں مات ہے پیارے

شعر کیا ہے عروض کیا شے ہے
فاعلُن، فاعلات ہے پیارے

دھونی اپنی رمائے بیٹھا جو
از پئے واجبات ہے پیارے

جام میں کچھ بچی کھچی ہو گی
رات کی باقیات ہے پیارے

جینے مرنے کی یہ حقیقت ہے
موت بھی اک حیات ہے پیارے

زندگانی بقا کی شیدائی
اصلِ موت و حیات ہے پیارے

کتنے عالم ہیں دُور نظروں سے
کچھ بھی از ممکنات ہے پیارے

تیرا آنا مگر مرے گھر میں
خارج از ممکنات ہے پیارے

جو غزل بھی کہی کبھی ہم نے
دفترِ واقعات ہے پیارے

شعر جو بھی ایازؔ کہتا ہے
بے تُکا واہیات ہے پیارے

☆

خیر میں ہوں کہ شر میں ہوں
کب فروکش تمہارے گھر میں ہوں

سایا مجھ پر کسی کا ہے شاید
لوگ کہتے ہیں میں اثر میں ہوں

چشمِ بد سے بچائے گا مجھ کو
بخت میرا تری نظر میں ہوں

وہ تو سودُ و زیاں سے غافل ہیں
کوئی سودا سمائے سر میں ہوں

اُن کی خوشبو کہیں سے آتی ہے
عین ممکن ہے وہ سفر میں ہوں

اور کس سے وہ ملنے آئیں گے
ایک میں ہی تو اِس نگر میں ہوں

☆

ہجر تھا یا وصال کس کا تھا
خواب تھا یا خیال کس کا تھا

سامنے وہ ہمارے بیٹھے تھے
دل میں اُن کے خیال کس کا تھا

غیر سے ہم نے مات کھائی تو
اِس میں کہیے کمال کس کا تھا

ہم گرے ہیں اگر بلندی سے
در حقیقت زوال کس کا تھا

بچ کے نکلے جو لاتعلق تھے
بچ نکلنا محال کس کا تھا

ریگِ ساحل پہ نقش باقی ہے
جسم وہ بے مثال کس کا تھا

شعر سنتے ہیں میرا کہتے ہیں
ایسا نازک خیال کس کا تھا

بام پر چاند تھا مگر پھر بھی
چاندنی میں جمال کس کا تھا

تان ہم پر ہی آ کے ٹوٹی ہے
پوچھئے گا ملال کس کا تھا

حق تو یہ ہے نہیں ملے اُن سے
پھر یہ کالر پہ بال کس کا تھا

پوچھئے کیا کسی نجومی سے
وقت کس کا ہے سال کس کا تھا

وہ جو رہتے ہیں صرف ماضی میں
کیسے جانیں کہ حال کس کا تھا

دار پر چڑھ گیا ایازؔ مگر
کس نے پوچھا سوال کس کا تھا

☆

آپ دو پل نکال سکتے تھے
آج یا کل نکال سکتے تھے

ہم پہ کشمیر چھوڑ دیتے وہ
اِس کا ہم حل نکال سکتے تھے

اپنی مصروف زندگی میں سے
میرے دو پل نکال سکتے تھے

آپ سستے میں چھوٹ آئے ہیں
سارے گس بل نکال سکتے تھے

پُورے قد سے اگر کھڑے ہوتے
آپ دلدل نکال سکتے تھے

ایک کانٹا نہیں ملا اُن کو
ہم تو جنگل نکال سکتے تھے

پھر بھی خوشبو ہمیں پتہ دیتی
آپ پایل نکال سکتے تھے

جو سمندر کو پی گئے درویش
منہ سے بادل نکال سکتے تھے

☆

شمار کیسا ، حساب کس کا
ہُوا نہ خانہ خراب کس کا

کہا نہ کچھ بھی تو ناخدا نے
تھی موج کیسی حباب کس کا

تھے کس بدن کے خطوط ایسے
میں کھینچتا تھا شباب کس کا

سنا ہے تُو کچھ اداس سا ہے
یہ رنگ لایا عذاب کس کا

گلی میں قاصد نکل بھی آئے
ہے آنے والا جواب کس کا

☆

جواز کس نے تراشے ہیں روشنی کے لئے
نہ ہو تو لاکھ بہانے ہیں تیرگی کیلئے

دیار نُور سے جگنو ہی کچھ اگر بھیجو
ہم اُن سے کام چلائیں گے روشنی کے لئے

نہ وہ غزال نہ وہ چشم اور نہ وہ جادو
کہاں فضا یہ موافق ہے شاعری کے لئے

ہوا، چراغ، شجر، سُر ، کرن، خوشبو
کہیں تو کوئی میسر ہو ہمدمی کے لئے

وہ اپنے آپ کو ایسے ہی دیکھتا جائے
ہمیں تو عکس ہی کافی ہے عاشقی کے لئے

ایازؔ تم کو کہاں دوستوں سے فرصت ہے
ملے گا کوئی کہاں تم کو دشمنی کے لئے

☆

کون ہے میں اگر کبھی پوچھوں
کاش آکر وہ خود کہے میں ہوں

کوئی منصف جچا نہیں اب تک
ایک مدت سے کٹھرے میں ہوں

میں کسی حکم کا نہیں تابع
اور ہوں گے جو دبدبے میں ہوں

آج میرا مزاج بگڑا ہے
یاد رکھنا یہ سر پھرے، میں ہوں

شام تک لوٹ کر نہیں آئے
کون جانے وہ راستے میں ہوں

کل کے اخبار میں خبر ہوگی
لوگ کہتے ہیں حادثے میں ہوں

وہ جو کہتے ہیں قافلے میں نہیں
عین ممکن ہے قافلے میں ہوں

سرسراہٹ سی بدن میں ہوتی ہے
وصل کے کون مرحلے میں ہوں

☆

تم پہ ایسا کبھی سماں گزرا
سانس لینا بھی جب گراں گزرا

تیرے جانے سے لوٹ آنے تک
اک زمانہ سا درمیاں گزرا

راستے میں پڑا ہوں مدت سے
وہ گزرتا مگر کہاں گزرا

سب کی نظریں تھیں اُس کے آنے پر
اس گلی سے وہ بے نشاں گزرا

میں بھی مارا گیا ہوں سنتا ہوں
جانے یہ حادثہ کہاں گزرا

پھر بھی پہونچے نہیں جزیروں تک
وہ سمندر بھی بے کراں گزرا

تم نے دوری میں کچھ کہیں پایا
وقت میرا تو رائیگاں گزرا

لڑکیوں کی ہیں اُنگلیاں زخمی
اس جگہ سے وہ نوجواں گزرا

میری چاہت میں تو تڑپتا ہے
رات وحشت میں یہ گماں گزرا

کب ہوا نے نہ راستہ روکا
کب سکوں سے یہ بادباں گزرا

ہم بھی سنتے ہیں لوگ کہتے ہیں
اب ہمارے جو درمیاں گزرا

ایک نیزے پہ آج سورج تھا
سر کو چھوکر وہ آسماں گزرا

راز دیوار و در کے کھلتے تھے
جس گلی سے وہ رازداں گزرا

☆

لباس اُس کا جو دھانی ہوگیا ہے
دوپٹہ آسمانی ہوگیا ہے

رگوں میں دوڑتا تو سرخ ہوتا
لہو آنکھوں میں پانی ہوگیا ہے

فنا ہوتے ہوئے سوچا جسے میں
وہی تو جاودانی ہوگیا ہے

لگی ہے آگ دل میں یا شجر میں
یہ نغمہ لن ترانی ہوگیا ہے

وہ جب سے لامکانی ہو گیا ہے
زمیں پر آسمانی ہوگیا ہے

کہاں جاتا وہ جنت سے نکل کر
وہیں جنت مکانی ہوگیا ہے

بھری محفل میں چھیڑا پھر کسی نے
وہ پھر سے پانی پانی ہوگیا ہے

جو دیکھی وسعتِ دامانِ قطرہ
سمندر پانی پانی ہوگیا ہے

وہ غافل دور ہم سے اسقدر ہے
عدم سے نیستانی ہوگیا ہے

ہے وصلِ یار بس اُن کی نوازش
برائے مہربانی ہوگیا ہے

شباب اُس کا جو قصرِ جادواں تھا
وہی اب دارِفانی ہوگیا ہے

بُلا لاؤ ایازؔ اُس شیشہ گر کو
خفا پھر یارِ جانی ہوگیا ہے

☆

پھُول غزل

شعر تب ہی نُزول ہوتے ہیں
جب قلم با اصول ہوتے ہیں

خوشبوؤں سا پیام ہوتا ہے
پھُول جیسے رسول ہوتے ہیں

جب کبھی اُن کا نام لیتا ہوں
میرے ہونٹوں پہ پھول ہو تے ہیں

پھول جتنے بھی ہوں لئے چلئے
اُن کے در پر قبول ہوتے ہیں

زعفراں، ہی، گلاب، بُم، پمپوش
اُن کے قدموں کی دُھول ہوتے ہیں

پھُول کھلتے ہیں اُن کی آہٹ پر
ورنہ ہر سُو ببول ہوتے ہیں

یاد میں اُن کی شعر کہتا ہوں
ورنہ یوں ہی فضول ہوتے ہیں

☆

یار مدت سے خفا ہیں کیوں نہیں
ہم بھی آتش زیرِ پا ہیں کیوں نہیں

اُن سے ملیے گا تو کہیے کون ہیں
ہم سے وہ بھی آشنا ہیں کیوں نہیں

کیا بتائیں ہم تو رُسوا ہو گئے
کوئی پوچھے بے وفا ہیں کیوں نہیں

ہوں علی کے خاکِ پا سے معتبر
وہ مرے مشکل کشا ہیں کیوں نہیں

قلمرو ہے مملکت اِک شعر کی
ہم یہاں فرمانروا ہیں کیوں نہیں

روح مومن جسم کافر کیوں ایازؔ
یہ تو کہیے پارسا ہیں کیوں نہیں

☆

میں شب سے سحر کے جو آثار مانگوں
میں فاروق مضطرؔ کے اشعار مانگوں

میں ظاہر کے سارے جزیرے ڈبودوں
میں باطن کی موجوں کے اسرار مانگوں

وہی شخص سارے شہر میں ہے یکتا
اُسی شخص کا میں بھی پندار مانگوں

قبیلے کے سارے جواں قید میں ہیں
میں اِن کے عوض اِن کا سَردار مانگوں

ابھی دشتِ امکاں سے باہر نہیں ہوں
عروسِ تمنا سے اقرار مانگوں

مرا فقر مجھ سے نہیں چھین لینا
کبھی مال وزر کے جو انبار مانگوں

اگر دے سکے تو فقط ایک چھت دے
نہ دروازہ مانگوں، نہ دیوار مانگوں

مرا چہرہ اموات میں ڈھونڈتا ہے
میں جب بھی کبھی تازہ اخبار مانگوں

مرے گھر کا آنگن سکڑتا گیا ہے
جو بونے رہیں ایسے اشجار مانگوں

تمہارے لبوں سے جو اُترا لہو میں
وہی نغمہ پھِر پھِر کے ہر بار مانگوں

اگر گونگی بستی ہے میرا مقدر
کوئی سلب کرلے یہ اظہار مانگوں

☆

قتل کرتا ہے تو دستور نبھانا ہوگا
سر ہمارا تجھے نیزے پہ اٹھانا ہوگا

کوئی دیوار ہو پردہ ہو کہ چلمن جاناں
درمیاں آئے کوئی اُس کو ہٹانا ہوگا

اُس کا تابوت اٹھا پائے نہ بیٹا لیکن
باپ کے قرض کا بوجھا تو اٹھانا ہوگا

کینچلی بن کے وہ چمٹی رہی شہمار کے ساتھ
آج لکڑی کو سرِ بزم جلانا ہوگا

اب تو فرعون کی تقدیر کا سورج ڈوبا
آج سورج کو ہتھیلی پہ اگانا ہوگا

دل میں آجانے کا وعدہ تو کیا ہے اس نے
دلنشیں اُس کا کوئی اور بہانا ہوگا

ہم جو کشمیر سے نکلے ہیں تو جموں ٹھہرے
دشتِ غربت میں کہیں پر تو ٹھکانا ہوگا

جس کی شاخوں میں پرندوں نے بسیرے ڈالے
اب وہی پیڑ اُسے کاٹ گرانا ہوگا

ہم شب و روز سلگتے ہیں اگر دوری میں
میرے کشمیر کا موسم تو سہانا ہوگا

ہمہ تن گوش اسی طرح زمانہ ہوگا
ہم نہ ہوں گے تو کوئی اور فسانہ ہوگا

اس کی نظروں کو نہ لگ جائے مرا زخم کہیں
اُس کی نظروں سے ہر اک زخم چھپانا ہوگا

مجھ کو دریا کے کنارے پہ یہ الہام ہوا
پھر نیا ایک شہر ہم کو بسانا ہوگا

شعر کہتے ہو تو اِس شہر میں مضطرؔ ہے ایازؔ
ہر نیا شعر اسے جاکے سنانا ہوگا

☆

باغ کب کا جل گیا ہے پھر بھی خوشبو دیکھنا
میرے شانوں پر مہکتا کوئی گیسو دیکھنا

اُس کی نظروں کے فسوں سے ہوش جب جانے لگیں
اُس کی طرزِ دلنوازی میں ہے جادُو دیکھنا

دید کی اُن دُھوپ کرنوں کا کرشمہ ہی تو ہے
ایک پل بھی تھم نہیں جاتے ہیں آنسو دیکھنا

ایک جنگل آج بھی ہے میرے خوابوں میں کہیں
سایۂ آسیب ہے کیا چشمِ آہُو دیکھنا

پیڑ پنچھی آشیاں تو دور صحرا میں نہیں
پھر بھی سنتے ہیں دمادم کیسی کُوکُو دیکھنا

اب بھی مجھ کو ہر سفر میں یاد آتا ہے ایازؔ
راہ چلتے اُس کا رکنا اور ہر سُو دیکھنا

☆

ہم نے بوئی تھی آس کھیتوں میں
پکنے والی ہے یاس کھیتوں میں

گھس رہا ہے بدن کا پیراہن
اُگ رہی ہے کپاس کھیتوں میں

کس کی دُھن میں گیا وہ کھیتی سے
گھومتا ہے اُداس کھیتوں میں

تشنہ کامی میں بجلیاں کوندیں
بجھنے والی ہے پیاس کھیتوں میں

فصل پکتی ہے آگ لگتی ہے
لوگ ہیں بدحواس کھیتوں میں

چھوڑ کر جب کسان جاتے ہیں
اُگ ہی آتی ہے گھاس کھیتوں میں

خوبصورت عجیب طائر تھا
دیکھنا آس پاس کھیتوں میں

جھڑ دیے برگ وبار پیڑوں نے
کون تھا بے لباس کھیتوں میں

عشق کمیاب تھا ازل سے ہی
ایک پودا پچاس کھیتوں میں

☆

میرا قصہ تمام کرنا تھا
مجھ کو الفت کے نام کرنا تھا

ایک چھوٹا سا کام کرنا تھا
دل کے وحشی کو رام کرنا تھا

ایک خوشبو ہوا کے جھونکے پر
عشق دنیا میں عام کرنا تھا

شاخ در شاخ بولتا پنچھی
اُس کو بھی زیرِ دام کرنا تھا

اُس نے دیکھا مجھے نہیں دیکھا
چین میرا حرام کرنا تھا

شعر کہنے میں کیا ملا ہم کو
ڈھنگ کا کوئی کام کرنا تھا

☆

ہے مرے شعر کا اثر شاید
دیکھ باہر ہوئی سحر شاید

پھر ہے آمادہ سفر شاید
اس نے باندھی ہے پھر کمر شاید

ایک در تھا کھلا، چلا آیا
آ گیا ہوں میں اپنے گھر شاید

آج کل پیار سے نہیں ملتا
کرنے والا ہے وہ سفر شاید

پوچھتا تھا پتہ ترے گھر کا
اُس کو ہونا ہے در بدر شاید

ساری دنیا کی مجھ پہ نظریں ہیں
تُو نے دیکھا تھا اِک نظر شاید

اب تو موسم گزر گیا ہوگا
اُس کا اُترا نہیں ثمر شاید

یہ بھی الزام ہے مرے سر پر
میں نے کاٹا ہے میرا سر شاید

جس کی خاطر غزل میں کہتا ہوں
اُس کو بھائے مرا ہُنر شاید

رات بھر آندھیوں نے گھیرا تھا
گِر گیا آخری شجر شاید

عشق کرتے نہیں تو کیا ہوتا
ہو ہی جاتی گزر بسر شاید

آج خوشبو نہیں ہواؤں میں
چھوڑ کر وہ گیا نگر شاید

نام عزت سے میرا لیتا ہے
اُس کو لگتا ہوں معتبر شاید

میں نے سایہ زمیں پہ دیکھا ہے
اک پرندہ ہے پیڑ پر شاید

ہر خبر ہے ایازؔ رسوائی
تم کو اپنی نہیں خبر شاید

☆

خود سے بھڑنے کی ابھی ہمت نہیں
یہ نزولِ شعر کی ساعت نہیں

خار بانٹو یہ ضروری تو نہیں
تم کو پھولوں کی اگر چاہت نہیں

رات دن یہ فکر لاحق ہے مجھے
دسترس میں میرے کیوں دولت نہیں

تیرے جلوؤں میں بھی وہ گرمی کہاں
میرے جذبوں میں بھی وہ شدت نہیں

سچ نہ بولے اس لئے خاموش ہے
جھوٹ کہنے کی اسے عادت نہیں

جب سے اُس کی شہرتیں معدُوم ہیں
تب سے مجھ پر بھی کوئی تہمت نہیں

جو بھی ہے اک نام سے منسوب ہے
خود سے عزت بھی نہیں شہرت نہیں

جس کی دُوری میں تڑپتا ہوں ایازؔ
جانتا ہوں اُس کو بھی راحت نہیں

☆

بھکشو سے خواہشات کا بن مانگتی رہی
کشکولِ تن میں عمر تپن مانگتی رہی

سر گوشیاں سُنی تھیں در و بام نے یہاں
خالی تھی چار پائی بدن مانگتی رہی

وہ لاش اپنی چھوڑ کے بھاگا نہ جانے کیوں
اُس کی برہنہ لاش کفن مانگتی رہی

لے کر چراغ رات کو پھرتی تھی خامشی
گنجینۂ حروف سُخن مانگتی رہی

دیکھا جو اُس نے ہم کو فراغت سے یاں کبھی
قسمت ہماری رنج و مُحن مانگتی رہی

موسم بہار کا بھی عجب کام کر گیا
اک بیل پھلنے والی صحن مانگتی رہی

گھڑیاں ڈبوئیں کس نے سر شام پھر یہاں
دو پل سکون کے جو تھکن مانگتی رہی

کس کا نہ جانے لمس سمایا لحاف میں
رہ رہ کے رات مجھ سے بدن مانگتی رہی

ہم نے سراب دیکھے ہزاروں سراب میں
اک گُونہ تشنگی تھی جو تن مانگتی رہی

خوشبو لباس شخص وہ گزرا یہاں سے تھا
صحرا کی ریت مجھ سے چمن مانگتی رہی

سرما کی سرد تیرہ و تاریک رات خود
رہ رہ کے در پہ آ کے پھِرن مانگتی رہی

خود تیرگی سے سہمی ہوئی شب ، تمام شب
دستِ دعا اٹھائے کرن مانگتی رہی

پارس منی تھی ناگ کے منہ میں چھُپی ہوئی
ناگن لپٹ لپٹ کے وہ پھن مانگتی رہی

دنیا نے ہم کو جور و جفا دے دیے ایازؔ
اِس داد کے عوض میں یہ فن مانگتی رہی

☆

ہوش و حواس گم تھے تو چہرے کھلے، کھلے
محفل میں اُس کی لوگ ملے بِن پیئے پیئے

میرا ہی خون میرے ہی ہاتھوں ہوا، ہوا
خنجر یہاں چلے کہ وہاں اب چلے چلے

تیری گلی کی خاک میں کوئی ملا، ملا
ہونے کو عمر آئی ہے یوں ہی پڑے، پڑے

ہم نے جواز رات بھر اُس کو دیا، دیا
اُس نے نہ ساری رات بجھانے دیے، دیے

مجھ سے کرے وہ پیار یہ میں نے کہا، کہا
کرتا ہے پیار جس سے وہ بے شک کرے، کرے

اُس نے وفا نبھانے کا وعدہ کیا، کیا
مرتا ہے کوئی عشق میں اُس کے مرے، مرے

اُس نے وجود مجھ میں کبھی ضم کیا، کیا
رہتا ہے اب بھی مجھ سے وہ غافل پرے، پرے

☆

کیوں شبِ غم کی سحر ممکن نہیں
ہو دعاؤں میں اثر ممکن نہیں

کربلا میں ہی سفر ہوگا تمام
روک دینا اب سفر ممکن نہیں

میں گیا بھی سامنے اُن کے کبھی
کرسکوں عرضِ ہنر ممکن نہیں

وقت رہتے ہم چلیں اس شہر سے
اب یہاں اپنی بسر ممکن نہیں

اُس بدن کی چاندنی میں کھوٹ ہے
مان لیں شمس و قمر ممکن نہیں

رات کاٹیں آج زیرِ آسماں
ہر جگہ دیوار و در ممکن نہیں

نرم گردن والے لوگوں سے سنا
کاٹ پائیں گے یہ سر ممکن نہیں

اِن پہاڑوں میں کہیں جو کھو گئے
لوٹ کر آجائیں گھر ممکن نہیں

رات کے پچھلے پہر بھی لوٹتے
بند ملتا ہم کو در ممکن نہیں

وہ تو سادھارن سا لڑکا ہے جناب
وہ بھی ہوگا دربدر ممکن نہیں

مرگیا جو لوگ کہتے ہیں ایازؔ
اور جھوٹی ہو خبر ممکن نہیں

☆

ٹھانی اس نے من میں کیا ہے
ورنہ رکھا بن میں کیا ہے

جو بھی ہے وہ من کے اندر
شعر میں کیا ہے فن میں کیا ہے

اپنی اپنی قسمت سب کی
ورنہ کِس دامن میں کیا ہے

رنگوں کا ہے کھیل تماشا
گُل میں کیا گلشن میں کیا ہے

بات فقط اک ہونے کی ہے
گھر میں کیا آنگن میں کیا ہے

میرا عکس ہے جب تک میں ہوں
بعد ازاں درپن میں کیا ہے

بانی صوفی سنتوں کی ہے
چُوڑی کی کھن کھن میں کیا ہے

تیرا گُل سے رشتہ مانا
بلبل اور چمن میں کیا ہے

اُس کی ایک جھلک جو دیکھے
اُس سے پوچھو تن میں کیا ہے

گورکھ دھندا بھائے اس کو
ورنہ اس الجھن میں کیا ہے

اُس کا لہجہ دھیما کیوں ہے
معنی صبح تھکن میں کیا ہے

تجھ سے آج لپٹ کر دیکھیں
ناگن تیرے پھن میں کیا ہے

جس نے چاہا جیسا سمجھا
مطلب اور سخن میں کیا ہے

بول تو میٹھے بول رہا ہے
اس کے دل دھڑکن میں کیا ہے

بھوکے بچے سوچ رہے ہیں
جانے کس برتن میں کیا ہے

روز جو مجھ کو یاد آتا ہے
میرے اس بچپن میں کیا ہے

گیت تمہارے تن کا لکھوں
آج بھی پوچھو من میں کیا ہے

سحر ہے کیسا انگڑائی میں
جادو دیکھ بدن میں کیا ہے

☆

جسم ہے یا سنطور رباب
پایل جس پر ہے مِضراب

پایل کے کیا اپنے گیت
بج اُٹھتا ہے مست شباب

اُس کا حسن اسی کا تھا
ویسا حسن ہے اب نا یاب

اُس کے تن کی خوشبو سے
مہکے گُلشن اور گلاب

ایک بھی جس میں لفظ نہ ہو
لکھیے ایسی ایک کتاب

☆

نہ شاخِ گُل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
ترے نغموں کی زد پر ہے یہ ساری انجمن بلبل

گلوں نے جب سے پہنی ہیں قبائیں خود فریبی کی
کرے پھرتا ہے بدلے میں سخن اندر سخن بلبل

بکھیری کس نے خوشبو ہے یہ چھیڑی تان کس نے ہے
گلوں کے پر نکل آئے ہوئی غنچہ دہن بلبل

ہزاروں کوشش کیجیے، وہ خوش الحانی نہیں آتی
بنے پھرتے ہیں گلشن میں اگر زاغ و زغن بلبل

خزاں کی آمد آمد ہے دبستانِ بہاراں پر
تو پھر اوراقِ گل سے ہی سئیں گے اب کفن بلبل

مجھے لگتا ہے بدلا سا، بکھرتا سا یہ گلشن کیوں
وہی گُل ہے وہی خوشبو وہی سَر و سمن بلبل

☆

وہ متانت کہاں وقار کہاں
شہر میں اب رہے چنار کہاں

حُسن کی اب وہ دلبری کیسی
عشق کا اب وہ کاروبار کہاں

ایک اِک کرکے سب بچھڑتے ہیں
ہم کہاں پر ہیں اور یار کہاں

وہ بھی کرتے نہیں ہیں وعدے اب
ہم سے ہوتا ہے انتظار کہاں

اس کی باتیں سنیں جو پہروں بھی
راز ہوتے ہیں آشکار کہاں

گُل کھِلے ہیں ہوا بھی بدلی ہے
پھر بھی گلشن میں ہے بہار کہاں

ایک لمحے میں کر گزر جانا
خود پہ ہوتا ہے اختیار کہاں

راستے منجمد غبار کہاں
داستانوں کے وہ سوار کہاں

میرے در پر نشاں نہیں لیکن
اپنی قسمت پہ اعتبار کہاں

دھوپ سے پہلے آندھیاں گزریں
پیڑ کوئی ہے سایہ دار کہاں

آج سُن لو ایاز کی غزلیں
ہاتھ آتا ہے بار بار کہاں

☆

نقش بر آب تھی جوانی بھی
پھِر گیا عشق اُس پہ پانی بھی

میری رُوداد بھی نہیں سنتا
اپنی کہتا نہیں کہانی بھی

کچھ تو اوراق ہیں گلوں میں بھی
کچھ صحیفے ہیں آسمانی بھی

شعر سنتے ہیں کہتے جاتے ہیں
اب تو سمجھایئے معانی بھی

چھوڑکر وہ گیا چلو لیکن
چھوڑ جاتا کوئی نشانی بھی

حسن اس کا اسی کے ساتھ گیا
وہ کہ تھا آپ اپنا ثانی بھی

ہم ترے در سے اُٹھ نہ پائیں گے
چھوڑ دیں گے یہ دارِ فانی بھی

☆

پھر وہی اندھا سفر پھر وہی تاریک رات
پھر وہ سارے وسوسے اندیشہ ہائے حادثات

اُس کو ٹھہرائیں تو کیسے موردِ الزام ہم
اب تلک پیدا ہوئی ہو ایک وجہ التفات

ہم پہ گزری ساعتیں وہ جب نظر آنے لگی
ایک چادر آسماں اور ایک مٹھی کائنات

گردشِ دوراں کے تابع ہجر بھی ہے وصل بھی
حسن اُس کا عارضی ہے عشق میرا بے ثبات

اُس کی قربت میں نہیں پھُولے سماتے ہیں ایازؔ
چار دن کی چاندنی ہے پھر وہی تاریک رات

☆

صبح لوٹیں اپنے گھر سو جائیں گے
جاگ جائے گا نگر سو جائیں گے

جب متاع خانہ ساری لُٹ گئی
کھول کر ہم سارے در سوجائیں گے

بھاگ جائیں گے سبھی کو چھوڑ کر
تھک کے جوں ہی ہمسفر سو جائیں گے

لٹ گئی مال ومتاعِ زندگی
ہم بھی گھوڑے بیچ کر سوجائیں گے

رہبروں کا خوف جب جاتا رہا
رہزنوں سے بے خطر سوجائیں گے

زخم جوں ہی جاگ جائیں گے مرے
تھک کے میرے چارہ گر سوجائیں گے

پھر نہ کوئی در پہ دستک دے ایازؔ
آج کی شب ہم اگر سو جائیں گے

☆

رنگ کی بات نہ خوشبو کی کوئی بات چلی
رات بھر یار کے گیسو کی کوئی بات چلی

پہلے نظروں کا ، طلسمات کا پھر ذکر چھڑا
آنکھ کے ساتھ ہی جادو کی کوئی بات چلی

جانے کس بات پہ یاروں میں چلے تھے خنجر
لوگ کہتے ہیں کہ ابرو کی کوئی بات چلی

جام پر جام چھلکتے رہے آخر شب تک
شام ڈھلتے ہی جو آنسو کی کوئی بات چلی

اس کی زلفوں کی مہک آئی نہ جانے کیسے
آنکھ کی بات تھی آہو کی کوئی بات چلی

وہ کب کُھل کر مل پاتا ہے
دیکھ کے مجھ کو شرماتا ہے

سردی گرمی آتی جاتی
درد کا موسم کب جاتا ہے

سوچ سمجھ کر میرے دل
دھوکہ پھر سے تُو کھاتا ہے

رات گئے تُو تنہائی میں
مجھ کو اکثر یاد آتا ہے

درد کی شدت کم ہوتی ہے
زخم بھی آخر بھر جاتا ہے

☆

قریہ قریہ ہے گلزار
اپنے گاؤں موسم چار

عشق کا موسم ہر کوئی
حسن کا موسم ایک بہار

چاند ہمارے گھر آئے گا
رات ہمارے ساتھ گزار

تجھ کو بھلایا ہم نے آخر
بھول گئے ہم تیرا پیار

آج بھی ہم کو یاد آتا ہے
گھر آنگن میں ایک چنار

عشق کے روگی پہونچے لوگ
باقی سارے لوگ گنوار

کتنے بھولے تھے درویش
پیڑ لگاتے سایہ دار

جتنے چھوٹے قد کے لوگ
اتنی اونچی ہے دستار

تم بھی ہم سے ہو ناخوش
ہم بھی خود سے ہیں بے زار

بھیڑ میں کتنے قاتل تھے
باز برآمد اک تلوار

☆

اُن کے ہونٹوں پر تبسم، کتنی تقریریں ہوئیں
لوگ جتنے تھے وہاں پر اتنی تاویلیں ہوئیں

ہم نے چاہا تھا تجھے بس بات اتنی تھی مگر
ایک اتنی بات پر کتنی تنقیدیں ہوئیں

عشق کے عنوان سے کوئی صحیفہ بھی نہ تھا
ایک چھوٹے لفظ کی لاکھ تفسیریں ہوئیں

تم سے نظریں مل گئی تھیں اسقدر معلوم ہے
بے خودی میں کون جانے کیسی تقصیریں ہوئیں

جانتے ہیں ہم کہ کہتے ہو بہت ہی کم ایازؔ
جو غزل تم نے کہی اس کی تعریفیں ہوئیں

☆

اگر مٹی میں خو شبو خون کی ہے
ہواوں میں مہک زیتون کی ہے

اُڑیں گی فاختائیں گلشنوں میں
عملداری اگر قانون کی ہے

چلیں صحرا میں ہم بھی گھر بنائیں
روایت یہ میاں مجنون کی ہے

جہاں پر بخت ہر دم جاگتے ہوں
کمی اُس شہر میں افیون کی ہے

امیرِ شہر کے نزدیک جانا!
حکومت کیا کسی ہارون کی ہے

☆

ساحل ساحل گیلی ریت
پیروں نیچے ڈھیلی ریت

ساگر کو یرقان ہوا
ہر سو دیکھی پیلی ریت

نیل کمل جب کھلتا ہے
دِکھ جاتی ہے نیلی ریت

جسم سے آکر لپٹی ہے
صحرا میں برفیلی ریت

پھولوں سے بھی نازک تھی
پہلے یہ پتھریلی ریت

دیکھ کے مجھ کو بچھتی تھی
پاؤں میں شرمیلی ریت

☆

دیکھو رنگ رسیلے ہونٹ
چھولو تو پتھریلے ہونٹ

سوکھے پیاسے ہونٹوں پر
آکے رکھدے گیلے ہونٹ

میں نے بوسہ کیا پوچھا
اُس کے پڑ گئے پیلے ہونٹ

نیلے داغ بدن پر ہیں
یا اس کے زہریلے ہونٹ

تنہائی میں چوم لیے
میں نے وہ شرمیلے ہونٹ

میٹھے ہوں یا تیکھے ہوں
کڑوے اور کسیلے ہونٹ

☆

خطِ کوفی میں وہ ابرو لکھنا
خطِ گلزار میں گیسو لکھنا

اُن کے ہونٹوں پہ کرم کی باتیں
کس نے ڈالی یہ نئی خو لکھنا

عشوہ و غمزہ، ادائیں یعنی
اُن کی ہر بات کو جادو لکھنا

رات وہ جسم مہکتا پڑھنا
صبح جو شعر ہو خوشبو لکھنا

دل کا وحشی نہیں بس میں میرے
کیسے کر پاؤں گا قابو لکھنا

یاد آتا ہے لڑکپن میں ایازؔ
نام تیرا ہی ہر اک سو لکھنا

☆

اُن کے جذبے سیاستوں کی طرح
پیار کرتے عداوتوں کی طرح

وحی اُترے قلم پہ نازل ہوں
شعر کاغذ پہ آیتوں کی طرح

نام لینا تو باوضُو لینا
عشق کرنا عبادتوں کی طرح

اب تو صدیاں گزرتی جاتی ہیں
غیر محسوس ساعتوں کی طرح

ہم جفاؤں کو بھی وفا سمجھیں
ظلم کرنا عنایتوں کی طرح

نام رکھنا خلوص ہی لیکن
کام لینا عداوتوں کی طرح

☆

تجھ سے جو منسوب ہوا
شخص مرا محبوب ہوا

جس نے تیرے لب چُومے
خوب وہی اسلوب ہوا

اُس نے رشتہ توڑ دیا
چلیے یہ بھی خوب ہوا

تیرے دھیان میں اکثر ہی
شعر ہوا جو خوب ہوا

حرف حق ہو جس میں بھی
شعر وہی مصلوب ہوا

ویسے کوئی بات نہ تھی
پھر بھی میں مرعوب ہوا

اس کی طلب میں آخر کار
میں ہی خود مطلوب ہوا

☆

بہت دنوں سے نہ میں نے پوچھا نہ تم نے پوچھا کہ حال کیا ہے
نہیں ہے کوئی بھی وجہ ایسی تو پھر یہ باہم ملال کیا ہے

میں اپنی دُھن میں کچھ اس طریقے جو اپنے ماحول سے کٹا ہوں
کہ مجھ کو یہ ہوش بھی نہیں ہے کہ روز و شب ماہ و سال کیا ہے

اگرچہ شیر و شکر ہوئے ہیں شناخت پھر بھی مٹا نہ پائے
ہم اُن سے ملتے رہے ہیں اکثر کوئی بتاؤ وصال کیا ہے

میں زینہ زینہ جو چڑھ رہا ہوں وہ میری سیڑھی نکال دے گا
میں پھر بھی چوٹی کو سر کروں تو وہ مجھ سے پوچھے کمال کیا ہے

ہر ایک پہلو سے اُس نے جانچا سلجھ نہ پایا کبھی جو اُس سے
وہ فلسفی بھی عجیب نکلا جو مجھ سے پوچھے سوال کیا ہے

ابھی مقدر ہے ساتھ اُس کے تو اوج پر ہے ستارہ اس کا
گرے گا جوں ہی وہ خاک پر تو سمجھ سکے گا زوال کیا ہے

میں اُس کے ہاں سے اٹھا تو اس نے کہا یہ اپنے مصاحبوں سے
نکلنا آدم کا خلد سے ہو ذرا بتاؤ مثال کیا ہے

☆

درد آخر درد ہے پوچھ کر آتا نہیں
اور جب یہ آگیا لوٹ کر جاتا نہیں

عشق کے اس روگ کی پہلی علامت ہے یہی
کوئی منظر سامنے ہو آنکھ کو بھاتا نہیں

زندگی کی منزلیں ہیں سب سرابوں کی طرح
دوڑتے ہیں سب مگر ان کو کوئی پاتا نہیں

اب کسی کے نطق میں بھی کیوں اثر باقی نہیں
اب کے کوئی شعر کیوں دل کو برماتا نہیں

حادثے اتنے ہوئے ہیں شہر نا ہنجار میں
سانحہ کوئی بھی ہو دل کو تڑپاتا نہیں

گونگی بہری بستیوں میں لوگ رہتے ہیں ایازؔ
کوئی کہتا بھی نہیں کوئی سن پاتا نہیں

☆

سرد بستر کی رات باقی ہے
یہ دسمبر کی رات باقی ہے

چاندنی کی ہوس ہے ہونٹوں پر
اُس گُل تر کی رات باقی ہے

ساری بستی پہ دن نکل آیا
میرے ہی گھر کی رات باقی ہے

شام ہوتے ہی کشتیاں ڈوبیں
اور سمندر کی رات باقی ہے

یوں تو خائف نہیں کسی سے میں
خوف کی ڈر کی رات باقی ہے

خیر سے دن گزر گیا لیکن
اب تو بس شر کی رات باقی ہے

شعر کہنے میں رات گزرے گی
سنگ کی سر کی رات باقی ہے

بجلیاں کوند کر گئیں کب کی
جلتے بجھتے شجر کی رات باقی ہے

☆

برف گرنے کا ہے منظر دیکھنا
ہر طرف ہے سنگِ مر مر دیکھنا

ٹھنڈ تو ہے ہاں مگر اتنی نہیں
تم ہو اندر میں ہوں باہر دیکھنا

چیل کوے اُڑ رہے ہیں برف میں
آ کے بیٹھے کچھ کبوتر دیکھنا

بجھ گئی ہے کب کی میری کانگڑی
جل رہی ہے کس کی چادر دیکھنا

لو زمیں پر اک سفیدی چھا گئی
اب بچھے گی موٹی چادر دیکھنا

لوگ ہانکے جارہے ہیں اِس طرف
اُس طرف ہے شورِ محشر دیکھنا

ہم کو سکھلایا بزرگوں نے ایازؔ
ایک قطرے میں سمندر دیکھنا

☆

گنے ہیں ہم نے ہر اک سمت میں ہزار درخت
کہیں ملا نہ ہمیں ایک سایہ دار درخت

دیارِ گرد میں یہ کِس کی آمد آمد ہے
بنے پھرے ہے ہر اک ذرۂ غبار درخت

کسی کے پاوں کی آہٹ کا معجزہ یہ ہے
بس ایک پل میں نکال آیا برگ وبار درخت

لکھے تھے نام کہ جس پر کُھرچ کے ناخن سے
تمہیں نہ یاد ہو شاید وہ نامدار درخت

مرا خیال نہیں ہے تو اِن کی خاطر آ
تمہاری راہ تکے ہیں یہ سوگوار درخت

عجب نہیں کہ ہوا اب اکھاڑ ہی پھینکے
جڑوں سے چھُوٹ گیا ہے وہ پائیدار درخت

ایازؔ ریت کے صحرا میں دل یہ کہتا ہے
ہر ایک سمت میں اگ آئیں بے شمار درخت

☆

اب کہیں پر بھی نہیں ہوگا چنار
میں نے گملے میں ابھی بویا چنار

میرے آنگن آ کے رویا رات بھر
پاس کی بَستی کا وہ بوڑھا چنار

شہر کے تاریک رستے پر مَرا
میرے گاؤں کا جہاندیدہ چنار

اِس نگر کو بد دعا دے جائے گا
اُس چورا ہے پر کھڑا سوکھا چنار

اس کی چھاؤں میں جو بیٹھا مرگیا
کس نے بویا تھا یہ زہریلا چنار

دوریوں کے تپتے صحرا میں کہیں
تیری یادوں کا اگر ہوتا چنار

☆

ردائے شب اُٹھا کر پھینکتا ہوں
سحر کے منہ پہ چادر پھینکتا ہوں

وہی بچپن کی عادت ہے ابھی تک
میں ہر اک شے اُٹھا کر پھینکتا ہوں

بھرے بازار میں جو کٹ گئے تھے
پسِ دیوار وہ سر پھینکتا ہوں

اُسے لوگوں نے گھیرا تھا جہاں پر
وہیں پر میں بھی خنجر پھینکتا ہوں

وہی سُوکھی سی ٹہنی ہے نظر میں
اُسی پر میں بھی پتھر پھینکتا ہوں

گلی تیری، وہ لڑکا اک لفافہ
کُھلی کھڑکی سے اندر پھینکتا ہوں

☆

جھومتے گاتے غُل مچاتے لوگ
اب کہاں ہیں وہ کھنکھناتے لوگ

مُڑ کے دیکھا تھا اُس نے کیا مجھ کو
ہر طرف تھے وہ مسکراتے لوگ

اُس گلی کے نصیب میں ہم تھے
اور گلیوں میں جگمگاتے لوگ

رات سایوں سے ہم الجھ بیٹھے
ہر طرف تھے وہ ڈگمگاتے لوگ

محفلوں میں نہیں ملے ہم کو
مقتلوں میں تھے گیت گاتے لوگ

شعر اب بھی ایازؔ کے اکثر
آتے جاتے ہیں گنگناتے لوگ

☆

ڈیڑھ گز کا تیرے سر پر طُرۂ دستار ہے
تجھ سے اونچی میرے گھر کی آج بھی دیوار ہے

اُس کا کمرہ ہے وہی پر فریم میں تصویر ہے
اک طرف عینک پڑی ہے اک طرف اخبار ہے

میں ابھی تک اپنے سایے کے تعاقب میں نہیں
قد کا اونچا ہے وہ مجھ سے پر مری رفتار ہے

رقصِ بسمل دیکھنے آئیں گے سارے یار دوست
اک طرف اُبرو کی جنبش اک طرف تلوار ہے

وہ خرامِ ناز خنجر نے نہ پایا حیف حیف
قاتلوں کے دست وبازو میں مری رفتار ہے

اس نگر کے لوگ سارے سر برہنہ ہو گئے
اُن کے قدموں میں پڑی اب اُن کی ہی دستار ہے

☆

اپنے ہر ایک کرب کو آخر سمیٹ کے
وہ سو رہا ہے درد کی چادر لپیٹ کے

اِک طفلِ تُند تیز نے مکتب سے بھاگ کر
ٹکڑے تھما دیے مجھے ٹوٹی سلیٹ کے

دن بھر بس ایک کام تھا پتھر سمیٹنا
زخموں کو اب گِنوں گا میں بستر پہ لیٹ کے

شاید کہ اب مکان کی تزئین کرسکو
میں جارہا ہوں آج ہر اک شے سمیٹ کے

بھونچال آنے والا ہے درویش نے کہا
تب سے ہوں انتظار میں ساماں سمیٹ کے

☆

وہ گئے موسم کا کوئی رنگ لے کر آئے گا
اور اگر میں یاد آیا سنگ لے کر آئے گا

امن کا بادل ہے لیکن میرے کھیتوں پر یہی
دیکھنا تم ایک دن یہ جنگ لے کر آئے گا

پھر مہک زلفوں کی آئے گی کھلے گی چاندنی
پھر وہ پیراہن کے لاکھوں رنگ لے کر آئے گا

پھر پرانے پتھروں سے بُت تراشے گا نئے
وہ نیا آذر نئے ہی ڈھنگ لے کر آئے گا

ہجر بھی ہے اک مصور اور مصور باکمال
وہ بہاروں میں خزاں کے رنگ لے کر آئے گا

اب عدو کے تذکرے میں وسعتِ دامن کہاں
ذکر اس کا قافیہ بھی تنگ لے کر آئے گا

☆

ہو گیا اک شخص کا گھیراؤ ، دیکھا آپ نے
پھر بھرے بازار پر پتھراؤ دیکھا آپ نے

جب وہ بادل جم کے برسا دُور صحرا میں ابھی
میرے کھیتوں پر ہوا چھڑکاؤ، دیکھا آپ نے

گہرے پانی سے نکل کر ناخدا جب سوگیا
آکے ساحل پر وہ ڈوبی ناؤ، دیکھا آپ نے

خود کو اپنے آپ جو نیلام کرتے ہیں یہاں
کس طرح بڑھتے ہیں اُن کے بھاؤ، دیکھا آپ نے

اس نے بھی سنتے ہیں اپنے درد کا درماں کیا
میرے بھی بھرنے لگے ہیں گھاؤ، دیکھا آپ نے

سایوں کے پیچھے بھاگتے شب ہو گئی تمام
میرے جنوں نے مجھ سے لیا خوب انتقام

کیوں کھول دیں دریچے کریں کس کا انتظار
یوں بیٹھے بند کمرے میں لیں کس سے انتقام

جب تک نیام میں تھی بڑی آب دار تھی
تلوار جو پڑی ہے وہ بے آب و بے نیام

مقتل کی راہ پر چلیں اذنِ سفر تو دے
چلنے کو ہم تیار ہیں با تزک واحتشام

گو لاکھ پاس آنے کی تھیں صورتیں ایازؔ
کچھ لوگ دُور دُور رہے حُسنِ انتظام

☆

دیکھا لوگوں کی آستینوں میں
سانپ پلتے ہیں اُن کے سینوں میں

جو کلینڈر اتار پھینکا ہے
میں بھی شامل تھا کچھ مہینوں میں

کس کا لاشہ اٹھائے پھرتا ہے
ڈھونڈھتا ہے کسے دفینوں میں

دل کا ساگر بھی ہوگیا صحرا
آگ جب سے لگی سفینوں میں

تیری صورت تھی دل نشیں لیکن
تم کو گنتے نہ تھے حسینوں میں

ذکر ہوتا تھا دل نشینوں میں
ہم بھی مقبول تھے حسینوں میں

☆

اُجلے نگر کا اے سائیں
رستہ بتا جا اے سائیں

دُھوپ کے اُجلے موسم میں
رات کا کھٹکا اے سائیں

پل دو پل ہی رک جاتے!
ایسا بھی کیا اے سائیں

مجھ سا تھا جو بھاگ گیا
تم نے دیکھا اے سائیں

لوگوں کی اس بھیڑ میں بھی
میں ہوں تنہا اے سائیں

پیڑ کی ٹھنڈی چھاوں میں
میں بھی آتا اے سائیں

میری کالی راتوں میں
چاند چمکتا اے سائیں

☆

گذ رے ہوئے موسم کا پتہ مانگ رہا تھا
اک شخص جو مسجد میں دعا مانگ رہا تھا

جس شہر میں سانسوں پہ بھی تعزیر لگی ہے
اُس شہر کی خاطر وہ ہوا مانگ رہا تھا

ممکن ہے کہ دفتر میں ملاقات نہ ہوگی
یہ سوچ کے گھر کا وہ پتہ مانگ رہا تھا

وہ کب سے اندھیروں کا نگہبان ہوا ہے
وہ شخص تو سورج کی ضیا مانگ رہا تھا

اب اس سے نہ مڈ بھیڑ سرِراہ کبھی ہو
جس شخص سے ملنے کی دعا مانگ رہا تھا

☆

تو نے اے دوست مجھے دل سے بھلایا ہوتا
تیری آنکھوں میں اُداسی کا نہ سایا ہوتا

میں تو راتوں کا مسافر تھا گزر ہی جاتا
تو نے اک صبح کا جادُو نہ جگایا ہوتا

میں نے پانی کی لکیروں میں گنوائیں نیندیں
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سمایا ہوتا

خود کو میں خود سے چھپاتا ہی رہا ہوں کب سے
تو نے اک لمحے مجھے مجھ سے چُرایا ہوتا

مجھ کو ہر سمت سے گھیرا ہے اندھیروں نے ایازؔ
دشتِ ظلمت میں کسی نور کا سایا ہوتا

☆

گئے دن کا سورج یہی کہہ رہا ہے
کہ اس شب پہ واجب مرا خوں بہا ہے

شبِ ہجر کالی ردا ہے کہ جس میں
مجھے اس نے ہر شام دفنا لیا ہے

کبھی سبز شاخوں سے پتے جھڑے ہیں
مرے ساتھ اکثر ہی ایسا ہوا ہے

مجھے بھی گھروندے بنانے کی ضد ہے
سمندر بھی پاؤں تلک آچکا ہے

اسے اونچے پیڑوں سے نفرت ہوئی ہے
سمجھتا نہیں اُس کا قد گھٹ گیا ہے

پگھلتی ہوئی برف یہ کہہ رہی ہے
کہ موسم کا پہلا شگوفہ کھلا ہے

کوئی اونچے پربت کی چوٹی سے اکثر
مرا نام لے کر مجھے پوچھتا ہے

☆

لہو کی وہ بارش ہوئی الاماں
وہ اُجلے پروں کے کبوتر کہاں

رُکے تو اندھیروں نے گھیرا ہمیں
چلے تو تعاقب میں تھیں بجلیاں

پرندے یہاں سے گزرتے تو ہیں
یہاں پر بناتے نہیں آشیاں

مرے دل کے صحرا میں اک بوند تھی
سمندر کہ کہنے کو تھا بے کراں

وہ جس رات کا کوئی سَورج نہیں
وہی رات ٹھہری ہے دار الاماں

بہاروں کی نوبت بجی ہے ایازؔ
وہ پھولوں کی دُھن میں چلیں تتلیاں

☆

تیرے ہاتھوں میں کہاں ہے وہ ٹھہرنے والی
وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھرنے والی

دھوپ کی پہلی کرن ڈھونڈھ رہی ہے جس کو
یہ وہی ہے کسی کونپل پہ اترنے والی

تو جہاندیدہ شجر ہے ابھی مایوس نہ ہو
پھر نئی رُت میں یہ صورت ہے نکھرنے والی

اُس کی رحمت کی کوئی حد تو نہیں ہے لیکن
میری جھولی بھی کہاں یار ہے بھرنے والی

موسم گل میں مرے درد کا درماں کیا ہو
اپنی حالت نہ کبھی بھی ہے سنورنے والی

وقت کی دھوپ سے خیرہ ہوئی آنکھیں ورنہ
ایک تصویر یہاں پر تھی ابھرنے والی

رنجشیں ساری یہی سوچ کے جھیلیں ہم نے
زندگانی ہے بہرحال گزرنے والی

ایک مٹی کا دیا ساتھ نبھاتا کب تک
یہ قیامت تھی کسی روز گزرنے والی

☆

کسی بھی تعلق سے پہچانتا وہ
مجھے دشمنوں میں ہی گردانتا وہ

اگر ٹوٹی کشتی کا تم ذکر کرتے
مجھے اس حوالے سے پہچانتا وہ

مرے جان دینے کی نوبت نہ آتی
اگر جانتا وہ اگر جانتا وہ

مری دسترس میں اگر کوئی ہوتا
مری جھوٹی سچی سبھی مانتا وہ

زمانے کو مجھ سے کہاں دشمنی تھی
مجھے دوستوں میں نہ گردانتا وہ

☆

اپنی ہی بات پہ ہر شخص اَڑا ہے لوگو
ہائے اس شہر پہ کیا وقت پڑا ہے لوگو

میرے بچپن کا وہ استاد بھی جھوٹا نکلا
وہ جو کہتا تھا خدا سب سے بڑا ہے لوگو

اِس شریفوں کے محلے میں نہ جانے کب سے
اُس چوراہے پہ کوئی شخص کھڑا ہے لوگو

طاقچے پر جسے بھولے ہوئے صدیاں گزریں
اُس صحیفے کے لئے کون لڑا ہے لوگو

کالے کوسوں کا سفر طے تو کیا ہے لیکن
آخری کوس یہی کوس کڑا ہے لوگو

دشتِ تنہائی میں پھر یاد کے پتھر ڈھونا
مرحلہ سخت وہی آن پڑا ہے لوگو

☆

معنی نگاہ سے تو بہت دُور دُور تھا
جو کچھ لکھا تھا اُس نے وہ بین السطور تھا

گلشن کے بندو بست سے لینا تھا عندیہ
خوشبو یہ کہہ رہی تھی کہیں پر ضرور تھا

نکلا جو صبح کو تو شگفتہ گلاب سَا
لوٹا جو شام کو تو وہ زخموں سے چُور تھا

جنگل کی آگ اُس کے لئے اِک حصار تھی
چوکھٹ کا دیپ اُس سے بہت دُور دُور تھا

سورج کو اپنے گھر میں وہ لانے پہ تھا بضد
جل کر جو راکھ ہو گیا اُس کا قصور تھا

اُس در پہ جان دینے کا انداز بھا گیا
ورنہ ایازؔ شخص بڑا ہی غیور تھا

ایاز قدرِ خود بشناس

کئی روز سے میں
پریشان ہوں،
حیران ہوں
مرا ذہن جیسے
کہ ماؤف ہے
مرے ہاتھ کی انگلیاں
مفلوج ہیں
قلم سامنے رکھ کے
بیٹھا ہوا ہوں
میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں
میں کچھ بھی نہیں سوچتا ہوں
خیالوں کے طایر
شکستہ پروں سے

کوئی سعی بھی نہیں کر رہے ہیں

جسارت حماقت

کسی پر بھی جیسے

میرا بَس نہیں ہے

میں شاعر نہیں ہوں

میں تحریر کے فن سے

واقف نہیں ہوں

میں تقریر سے بھی

ابھی نابلد ہوں

مگر یہ بھی سچ ہے

کہ کچھ شعر میں نے کہے ہیں

کئی نقش میں نے گھڑے ہیں

یہاں پر کئی بار

تقریر کی ہے

میرے فن کی یاروں نے

تعریف کی ہے توصیف کی ہے
تو پھر کئی روز پہلے
یہ پھر کیا ہوا تھا
کئی روز پہلے بس اتنا ہوا تھا
اسیرؔ صاحب نے مجھ سے کہا تھا
ہمالہ کی چوٹی پہ چڑھ کر
میں آکاش چھولوں
دمکتا چمکتا وہ سورج
ہتھیلی پہ رکھوں
اور اطراف واکناف میں
پھیلی ہوئی روشنی کو سمیٹوں
پہاڑوں کے اسرار جانوں
کہ میں ریگزاروں سے وسعت کے
امکان پوچھوں
میں شبنم کی بوندیں

نظر میں پرولوں
گلوں کے چٹکنے کے اسرار کیا ہیں
اور بلبل کے نغمے کی آواز کیا ہے
اسیرؔ صاحب نے مجھ سے کہا ہے
کہ میں اپنے والد پہ مضمون لکھوں!!

قطعات

کبھی یقین کے جنگل نے راستہ روکا
کبھی گمان کی دلدل نے راستہ روکا
ہُما مزاج کو افلاک آشیانہ ہے
نہ بادِ تند نہ بادل نے راستہ روکا

ابھی ہے دشتِ تمنا سراب رہنے دے
مرے حضور میں جامِ شراب رہنے دے
مرے نصیب کی مٹی خراب رہنے دے
مری شناخت ہے کنتُ تراب رہنے دے

فصلِ گُل کی تاک میں زندہ رہو
یوں خس وخاشاک میں زندہ رہو
جب ہوائے ناموافق چل پڑے
بیج بن کر خاک میں زندہ رہو

ہر کس وناکس یہاں غمناک ہے
اڑ رہی ہر اک روش سے خاک ہے
ظلم کا موسم ستم کی آندھیاں
زندگانی کیا؟ خس وخاشاک ہے

اعتراف

چلو مانتے ہیں کہ ہم ہی غلط تھے
نہ شب کی طوالت کا شکوہ بجا تھا
نہ سورج کی پہلی کرن معتبر تھی
وہ ساری سپیدی فریبِ نظر تھی
پرندے بھی سچے پیمبر نہیں تھے
وہ صبح کا ستارہ سحر تھا فسوں تھا
اجابت ہماری دعا کی نہیں تھی
فضاؤں میں خوشبو صبا کی نہیں تھی
کلی کے چٹکنے کی آواز باطل
وہ مسجد کا مینار خاموش ہی تھا
سماعت ہماری ہی شوریدہ سر تھی
چلو مانتے ہیں کہ ہم ہی غلط تھے

شب تیرہ وتار اب بھی جواں ہے
بہت دور کرنوں کا وہ کارواں ہے
ابھی دشت پر ہے سیاہی مسلط
ابھی شب کی چادر میں لپٹا جہاں ہے
چلو مانتے ہیں کہ ہم ہی غلط تھے

دکھا بھی نہ سکوں

میرے ٹیبل پہ مرے سامنے آ بیٹھتی ہے
میری فائیلوں میں خدا جانے وہ کیا دیکھتی ہے
میری عینک میرے ٹیبل سے اٹھا لیتی ہے
میری پنسل کو وہ دانتوں سے چبا لیتی ہے
میری سگرٹ میرے ڈرائیر سے چرا لیتی ہے
میرے گھر میں میرے دروازے پر
میرے کالر میں وہ اک پھول سجا لیتی ہے
راہ چلتے وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے
میرے بالوں پہ جمی دُھول ہٹا لیتی ہے
میری نیک ٹائی کی گرہ ٹھیک بٹھا لیتی ہے
میرے کمرے میں میرا ہاتھ بٹا لیتی ہے
میرے سرہانے تپائی پہ وہ پانی رکھا!
میرے پہلو میں مرے ساتھ لگی ہے وہ مگر
مجھ سے وہ دور ہے اتنی کہ دکھا بھی نہ سکوں

اگر

اگر میرے کمرے میں مکیں
سناٹے کی دیوی
میرے بَس میں ہو جائے
تو میں نغموں کی پازیب
اُس کے پاؤں میں ڈالوں
الفاظ کی چوڑیاں
کلائی میں پہنا کر
"چھما چھم چھم چھم
باجو بند کُھل کُھل جائے"
اشاروں پر نچادوں

ایک آواز

ایک آواز
سنسناتی پھری
ایک کھڑکی کھلی
محلے کی کھڑکیاں
کھلتی گئیں
پھر سکوت طاری تھا
کھلی کھڑکیوں سے جھانکتے
سناٹوں نے سرگوشیاں کس
آواز!
آواز!
میرے کمرے میں دم توڑ
میری کھڑکی سے باہر جھانکتے سناٹے
خاموشی چھا گئی
کھڑکیاں ایکا ایکی
بند ہوتی گئیں

تازہ سَراب

یوں نئے شہر میں آتا ہوں کہ جیسے کہ یہاں
کوئی نظروں کو بچھائے گا میری راہوں میں
اور پلکوں پہ بٹھا لے گا مجھے
میرے بالوں پہ جمی گرد سفر کی لے کر
مانگ میں اپنی بھرے اور دعا دے گی مجھے
ہر نئے شہر میں آتے ہوئے محسوس ہوا
زندگانی کے خم و پیچ
سفر ہوگا تمام
اجنبی راہ میں مل جائیں گے

شناساؤں کے نشاں

جانے پہچانے سے سایوں سے ملاقات کوئی

بھولے بسرے ہوئے لمحوں کی کوئی بات کہیں

راہ چلتے ہوئے روکے گی

پکارے گی مجھے

راہ چلتا ہوں تو یہ سوچ کے

رک جاتا ہوں

مرمریں ہاتھ اُتر آیا ہے شانے پہ مرے

کسی چلمن سے لگی آنکھ یہاں دُور سے ہی

اپنی نظروں کی خنک چھاؤں میں لیتی ہے مجھے

ہر نئے شہر سے کیا کیا نہ امیدیں باندھیں

بات پہلے تھی جہاں بات وہیں ہے اب بھی

روز اک شہر گزرتا ہے مرے پاؤں تلے

زندگی آج بھی تو ہے کسی صحرا کی طرح

ہر نیا شہر کہ ہے آج بھی اک تازہ سراب

اکیسواں جنم دن

زمیں سے کچھ اور
مٹی کھودی گئی
قبر کچھ اور گہری ہو گئی
چند اور اینٹیں
مقبرے کی خاطر
بوڑھا مزدور
ڈال کر گیا ہے
آج
اکیسواں گیارہ جون تھا

ڈل

ڈل کے پانی بتا
ڈل کے پانی بتا
تیرا ہر دور میں
رنگ ایسا ہی تھا

ڈل کے پانی بتا
گزرے وقتوں میں بھی
تیری آغوش میں
کوڑا اکرکٹ پڑا؟

ڈل کے پانی بتا
اُس گئے وقت میں بھی
تیرا دامن پھٹا
جسم تیرا کٹا؟
ڈل کے پانی بتا؟

مرمر گیت

مرمر کی وہ مُورت جیسی
مرمر کا ہے اُس کا گھر
مرمر کی ہیں سب دیواریں
مرمر کے ہیں بام و در
مرمر کا ہے آنگن اُس کا
مرمر کے ہیں سب پتھر
مرمر کا ہے اک تالاب
مرمر کے ہیں وہ بطخ
مرمر کے ہیں وہ گملے
مرمر کے ہیں وہ پودے
مرمر کے ہیں سارے پھول
مرمر کے ہیں اس کے پیڑ
مرمر کے ہیں ان کے پھل

مرمر کے ہیں سب پنچھی
مرمر کے ہیں اُن کے پر
مرمر کا ہے اُس کا چاند
مرمر کی ہے اُس کی دھوپ
مرمر کا ہے اس کا دن
مرمر کی ہے اُس کی رات
مرمر کی ہے اُس کی صبح
مرمر کی ہے اس کی شام
مرمر کی گھنگھور گھٹا
مرمر کی ہے تیز ہوا
مرمر کے ہی کمرے میں
مرمر کا ہے اس کا بچھونا
اس پر مرمر کی چادر
مرمر کے ہی اس کے تکیے
مرمر کی ہے وہ جھالر

مرمر کا ہی جسم ہے اُس کا
مرمر کا ہے اس کا تن
مرمر جیسا صاف بدن
مرمر کے ہی اُس کے شانے
مرمر کی باریک کمر
مرمر کے لہرائے بازو
مرمر کا ہے اُس کا سر
مرمر کا ہی وہ چہرہ
مرمر کی وہ پیشانی
مرمر ہی کے اس کے گال
مرمر کی ہی گوندھی چوٹی
مرمر کے ہی اُس کے بال
مرمر کی ہی پلکیں ہیں
مرمر کی ہی آنکھیں ہیں
مرمر کی ہے اس کی ناک

مرمر کی ہے ناک پہ نتھ
مرمر کی ہے وہ گردن
مرمر کا ہے اس میں ہار
مرمر کی ہے اس کی لٹ
مرمر کا ہے اس میں تار
مرمر کے ہیں وہ جھمکے
مرمر کی ہے کان کی لو
مرمر کا ہے اس کا منہ
مرمر کے ہیں اس کے لب
مرمر کی ہے وہ مُسکان
مرمر کی ہے وہ چتون
مرمر کے ہی وہ عشوے
مرمر کے ہی وہ نخرے
مرمر کی ہر ایک ادا
مرمر کے ہی وہ انداز

مرمر کے ہی اس کے لفظ

مرمر کی ہی وہ آواز

مرمر کے ہی اس کے گیت

مرمر کے ہی وہ اشعار

مرمر کے ہی اس کے راگ

مرمر کے ہی اس کے ساز

مرمر کی ہی اس کی لے

مرمر کی ہے اس کی تال

مرمر ہونٹوں کی لالی

مرمر آنکھوں کا کاجل

مرمر کے ہیں وہ کنگن

مرمر کا ہے وہ جھومر

مرمر کے ہی پاؤں میں

مرمر کی ہے وہ پازیب

مرمر جیسی کلائی میں

مرمر کی ہی چوڑی ہے
مرمر کی ہی انگلی میں
مرمر کی انگوٹھی ہے
مرمر کی گلکاری ہے
مرمر کی ہی ساری پر
مرمر کے ہیں سب ملبوس
مرمر کے ہیں سب زیور
مرمر کی ہے اس کی رسوئی
مرمر کے ہیں اس کے برتن
مرمر کا ہے چکلہ بھی
مرمر کا ہے اک بیلن
مرمر کا ہی آٹا ہے
مرمر جیسے ہاتھوں سے
گوندا اُس نے مرمر پر
مرمر کی اس بھٹی میں

مرمر کی ہی لکڑی سے
مرمر جیسی آگ ہے سلگی
مرمر کی اب روٹی اس نے
مرمر کی ہی آنچ پہ سینکی
مرمر کے ہی توے پر
مرمر کے ہی اُس کے بچے
مرمر کا ہی اُن کا ابا
مرمر کے ہی دسترخوان پہ
سارا کنبہ بیٹھ گیا ہے